بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایم اے، نیٹ، سیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی ودیگر
مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے ایک معاون ماخذ

اُردو اَصنافِ ادب

مرتب:

عطاء الرحمٰن نوری

M.A., B.Ed., MH-SET, Journalist
E-mail - atanoori92@gmail.com
Cell.: 9270969026

------پبلیشر------

رحمانی پبلکیشنز

1032 انصار روڈ، ڈاکٹر سراج احمد کے دواخانے کے سامنے، اسلامپورہ،
Mob : 9890801886 / 9270704505 مالیگاؤں، مہاراشٹر

نام کتاب	:	اردو اصنافِ ادب
مرتب	:	عطاء الرحمٰن نوری
سالِ اشاعت	:	2016ء
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	64
کمپوزنگ	:	عطاء الرحمٰن نوری
طباعت	:	سیفی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں
قیمت	:	-/40

----- Publisher-----

Rahmani Publication

1032,Islampura,Malegaon-423203(Dist-Nasik)
Mob : 9890801886 / 9270704505

فہرست

کلمۂ تعارف

عطاء الرحمن نوری (مبلغ سنی دعوتِ اسلامی) کا نام اب دینی و علمی اور ادبی و صحافتی دنیا میں نیا نہیں رہا۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے مذہبی و اصلاحی موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ایک دعوتی و اصلاحی تحریک ''سنی دعوتِ اسلامی'' سے منسلک ہونے کی وجہ سے اُن کے اندر اصلاحِ امت اور صالح معاشرے کی تشکیل کے تئیں مثبت رویے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مضامین میں اصلاحِ معاشرہ کا گہرا رچاؤ پایا جاتا ہے۔ سلجھے ہوئے انداز میں وہ سنجیدہ خطابت کے ذریعے بھی پیغامِ حق و صداقت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ عطاء الرحمن نوری کے تحریر کردہ مضامین ملک بھر کے اخبارات و رسائل کی زینت بن کر اہلِ علم و دانش سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔

۳؍ مارچ ۱۹۸۸ء کو شہرِ ادب مالیگاؤں میں آنکھ کھولنے والے اِس نوجوان نے فارمیسی میں ڈپلومہ کرنے کے بعد اپنا تعلیمی سلسلۂ شوق جاری رکھتے ہوئے صحافت کا کورس مکمل کیا۔ مزید برآں اردو ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے ۶؍ ستمبر بروز اتوار ۲۰۱۵ء کو ریاست مہاراشٹر کی جانب سے پہلی بار اردو زبان میں منعقدہ اسٹیٹ الیجیبلیٹی ٹیسٹ (سیٹ) جیسے مشکل ترین مقابلہ جاتی میں حصہ لیا، اور اس مشکل ترین امتحان میں پہلی ہی شرکت میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی، اس کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے اور حصولِ تعلیم کے لیے نئے جزائر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے فی الحال بی۔ایڈ میں مصروف ہیں۔ دعا ہے کہ مستقبل میں اُن کے پی ایچ ڈی کے مستحکم ارادے کو اللہ کریم پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین!!

عطاء الرحمن نوری کا قلمی سفر مضامین و مقالات سے آگے بڑھتے ہوئے تصنیف و تالیف کے میدان کی طرف رواں دواں ہے۔ پیشِ نظر کتاب ''اردو اصنافِ ادب'' سے پہلے اُن کے موئے قلم نے چار کتب کا تحفہ دینی و علمی دنیا کو پیش کر کے اہلِ نقد و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اُن کی پہلی پیش کش دنیائے کفر سے ۱۲۵ لڑائیاں لڑنے والے عظیم المرتبت مجاہد، اسلامی تاریخ

کے اولوالعزم شمشیر آزما، نام ورسپہ سالار اور عبقری جرنیل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مختصر تعارف پر مبنی کتاب ''حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ'' اسلام کے اِس بطلِ جلیل کا معلومات افزا قبالہ ہے۔ دوسری کتاب ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ'' اسلام کی مہتم بالشان اور اولین درس گاہِ نبوت کے ممتاز طالب علم اور ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی کے رخِ حیات کے مختلف جگمگاتے گوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تیسری پیش کش ''حضرت سید احمد کبیر رفاعی کی چند ناصحانہ باتیں'' سلسلۂ رفاعیہ کے سرتاج سلطان الاولیاء و العارفین حضرت سید احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ العزیز کے اقوال و ارشادات کا دل کش مرقع ہے، جس کا مطالعہ عملی زندگی کی کامیابی و کامرانی اور دنیوی واُخروی فلاح کی ضمانت میں معاون ثابت ہوگا۔ عطاء الرحمن نوری کی چوتھی پیش کش ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علما کا مجاہدانہ کردار'' وطن عزیز ہندوستان کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علما و قائدین کا مختصر مگر جامع تعارف علمائے اہل سنت کی کتب و رسائل کی روشنی میں خوانِ مطالعہ پر سجایا ہے۔ عطاء الرحمن نوری کی یہ قلمی ریاضتیں یقیناً سراہے جانے کے لائق ہیں۔

پیشِ نظر کتاب ''اردو اصنافِ ادب'' اِس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ عطاء الرحمن نوری نے اسے ایم اے، نیٹ، سیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے استفادہ کی غرض سے مرتب کیا جو ایک طرح سے خیر کا عمل ہے۔ جس کا اجر اللہ رب العزت جل جلالہٗ بہتر طور پر ادا فرمائے گا۔

''اردو اصنافِ ادب'' میں عطاء الرحمن نوری نے اردو کی مروجہ اصنافِ ادب کا آسان اور صاف ستھری علمی زبان میں مثالوں اور حوالوں کے ساتھ تعارف پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اس کتاب میں اصنافِ ادب کے دونوں حصوں (A) اصناف سخن یعنی شعر و شاعری اور (B) اصناف نثر کا تعارف کراتے ہوئے، اصنافِ سخن یعنی شعر و شاعری کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے عطاء الرحمن نوری نے (الف) موضوع کے اعتبار سے تقسیم، (ب) ہیئت کے اعتبار سے تقسیم کے تحت: حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، پیروڈی، گیت، ہجو......اور......مثنوی، رباعی، قطعہ، مُسمّط، ترکیب

بند، ترجیع بند، نظم، پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم، سانیٹ، ترائیلے، ہائیکو، نثری شاعری کی تعریفیں مع مثال پیش کی ہیں۔

اصنافِ ادب کے دوسرے جز یعنی ''اصناف نثر'' میں عطاء الرحمن نوری نے سادہ نثر، سلیس نثر، مقفّٰی نثر، مسجّع نثر، رنگین نثر کی تعریفیں اور مثالیں پیش کی ہیں اِس کے علاوہ اِس باب کو دو ضمنی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے (الف) افسانوی نثر کے تحت: داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ کا تعارف پیش کیا ہے اور (ب) غیر افسانوی نثر کے تحت: مضمون، انشائیہ، خطوط یا مکتوب، سوانح، خودنوشت سوانح، دیباچہ، سفرنامہ، آپ بیتی، خاکہ، رپورتاژ، طنز و مزاح جیسی اصنافِ نثر کا بہترین انداز میں تعارف کرایا ہے۔ اِن کے علاوہ (C) تنقید (D) تحقیق اور (E) تذکرہ بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے معلومات افزا ہیں۔

عطاء الرحمن نوری کی مرتبہ ''اردو اصنافِ ادب'' اردو دنیا کے لیے ایک گراں قدر اور بہترین تحفہ ہے۔ ان شاء اللہ ادب کے طلبہ، مقابلہ جاتی امتحانات کے شرکا، کالج کے پروفیسرز، نقاد اور شعرا و ادبا مرتب کی اِس اہم ادبی خدمت سے یقیناً مستفیض ہوں گے۔

عطاء الرحمن نوری کی یہ اہم پیش کش ایک نفع بخش علم کی ترویج و اشاعت کے زمرے میں ہی شمار کی جائے گی جو ایک قسم کا صدقۂ جاریہ بھی ہے۔ ناچیز برادرم عطاء الرحمن نوری کو اِس اہم کتاب کی ترتیب و اشاعت پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ کریم جل جلالہٗ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ و طفیل اُن کے صالح عزائم کو استحکام تکمیل سے ہمکنار فرمائے، آمین!!۔

(ڈاکٹر)۔محمد حسین مُشاہدؔ رضوی

۲۷/ذوالحجہ ۱۴۳۷ھ/ ۳۰/ستمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعہ

Dr. Muhammed Husain Mushahid Razvi
S.r. No. 39 P.No. 14 Naya Islampura
Malegaon 423203 Nashik (M.S.)
mushahidrazvi79@gamil.com
09420230235 / 09021761740

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ چند

ایم اے سال دوم (۲۰۱۵ء) ہی سے یو.جی.سی کے تحت اسسٹنٹ پروفیسر شپ اور پی ایچ ڈی کی اہلیت کے لیے ہونے والے معروضی امتحان ''نیٹ'' کی تیاری شروع کردی تھی، اب یہ امتحان یو.جی.سی کی نگرانی میں سی بی ایس سی کے تحت منعقد ہوتا ہے۔اس امتحان کی تیاری کے لیے طے شدہ نصاب کے مطابق اپنی اسٹڈی کا آغاز کیا،اساتذۂ کرام نے رہنمائی فرمائی،سٹی بک ڈپو مالیگاؤں سے معروضی امتحانات کے متعلق دستیاب تمام کتابیں خریدیں، دہلی، ممبئی سے کتابیں منگوائیں اور نصاب کے پیش نظر ذاتی نوٹس کی ترتیب کا کام شروع کیا۔اسی دوران ۶/ستمبر بروز اتوار ۲۰۱۵ء کو ریاست مہاراشٹر کی جانب سے اسٹیٹ اہلیتی ٹیسٹ کا پہلی بار اُردو مضمون میں انعقاد ہوا،اس امتحان کی تیاری کے لیے مذکورہ نوٹس کافی مددگار ثابت ہوئیں،جس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی اورساوتری بائی پھلے پونا یونی ورسٹی کی نصابی کتابوں سے،گھر میں موجود ادبی کتابوں اور آن لائن دستیاب ہر صنف پر مخصوص کتابوں کی مدد سے اضافہ کیا۔اللہ پاک نے اپنے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے پہلی ہی کوشش میں ایم ایچ سیٹ جیسے مشکل امتحان میں کامیابی عطا فرمائی ۔اسی اثنا میں ایم ایس جی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر شپ کے لیے ویکینسی نکلی،مذکورہ نوٹس کو ہم نے از سر نو مرتب کیا اور ۱۶/مئی ۲۰۱۶ء کو ناسک ہیڈ آفس میں کامیاب انٹرویو دیا۔اسی کے ساتھ تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں،بی ایڈ کی پڑھائی بھی ہوتی رہی

اور محب مکرم رضوان ربانی سر کے حکم پر ادارۂ فیضان ربانی اسلام پورہ مالیگاؤں میں فری نیٹ اور سیٹ کی کلاسیس میں لیکچرز بھی لیتا رہا۔دوست واحباب نے جب اس نوٹس کو دیکھا تو اصرار کیا کہ اسے شائع کیا جائے تا کہ ہر طالب علم اس سے استفادہ کر سکے۔یوں تو مارکیٹ میں بہت سی ادبی کتابیں دستیاب ہیں مگر رسائی اور توجہ کی کمی کے سبب اسٹوڈنٹس امتحان کے وقت کشمکش کا شکار رہتے ہیں،حتیٰ کہ ماسٹر ڈگری میں آنے کے بعد بھی اردو اصناف ادب سے انہیں مکمل واقفیت نہیں ہو پاتی۔اس لیے تمام اصناف ادب کو بہت ہی مختصر میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ صفحات کی زیادتی کے سبب اسٹوڈنٹس بوجھل پن اور اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ایم اے، نیٹ، سیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے ایک تفصیلی کتاب اختتامی مراحل میں ہے۔ان امتحانات کے لیے یہ رسالہ ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔ان امتحانات میں کامیابی کے لیے کتاب میں موجود تمام اصناف ادب کا گہرائی و گیرائی سے مستقل مزاجی اور سخت محنت کے ساتھ مطالعہ کرنا ازحد ضروری ہے۔

مرتب:

عطاء الرحمن نوری
M.A., B.Ed., MH-SET
Journalist

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح اُردو زبان وادب میں بھی اصناف ادب کے دو حصے ہیں۔

(A)اصناف سخن یعنی شعروشاعری۔

(B)اصناف نثر۔

اصناف سخن کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے دوخانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) موضوع کے اعتبار سے تقسیم:

موضوع کے لحاظ سے اردو شاعری کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱)حمد(۲)مناجات(۳)نعت(۴)منقبت(۵)غزل(۶)قصیدہ(۷)مرثیہ
(۸)شہرآشوب(۹)واسوخت(۱۰)ریختی(۱۱)پیروڈی(۱۲)گیت(۱۳)ہجو۔

(ب) ہیئت کے اعتبار سے تقسیم:

ہیئت کے لحاظ سے اردو شاعری کی مندرجہ ذیل قسمیں بتائی جاتی ہیں۔

(۱)مثنوی(۲)رباعی(۳)قطعہ(۴)مُسمّط(۵)ترکیب بند(۶)ترجیع بند(۷)نظم☆ پابند نظم☆معریٰ نظم☆ آزاد نظم(۸)سانیٹ(۹)ترائیلے(۱۰)ہائیکو(۱۱)نثری شاعری۔

(الف) موضوع کے لحاظ سے اصناف سخن کی تعریف وتفصیل:

☆**شعر:** شعر غزل کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔شعر کی سطر کو مصرع کہا جاتا ہے۔

(۱) حمد:

حمد ایک عربی لفظ ہے،جس کے معنی ''تعریف'' کے ہیں۔اللہ کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو ''حمد'' کہتے ہیں۔حمد باری تعالیٰ کئی زبانوں میں لکھی جاتی رہی ہیں۔عربی،فارسی اور اُردو زبان میں اکثر دیکھی جاسکتی ہیں۔حمد کے لیے ضروری ہے کہ شاعر بارگاہِ صمدیت کے آداب کا مکمل

خیال رکھے،لب ولہجہ انتہائی مؤدب اور عاجزانہ وانکسارانہ ہو۔زبان پاکیزہ،شستہ اور بلیغ ہو۔ساتھ ہی شاعر اس بات کا بھی دھیان رکھے کہ حمد عشق الٰہی میں ڈوب کر تحریر کی جائے نہ کہ محض رسمی اور دکھاوے کے لیے ہو۔ذیل میں مولانا احمد رضاؔ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا
تمہیں حاکم برایا تمہیں قاسم عطایا
تمہیں دافع بلایا تمہیں شافع خطایا

(۲) مناجات:

مناجات کا مطلب ہے دعا۔ایسا کلام جو بارگاہ صمدیت میں بطور التجا پیش کیا جاتا ہے مناجات کہلاتا ہے ؎

الٰہی مدد کر مدد کی گھڑی ہے
گناہوں کے دلدَل میں کشتی پھنسی ہے
مِرے دل پہ غفلت کی چادر پڑی ہے
نحوست گناہوں کی چھائی ہوئی ہے
یہی بات ہم نے بڑوں سے سنی ہے
نہ ہو بندگی گر تو کیا زندگی ہے
اے ابر کرم آ برس جا برس جا
عجب آگ عصیاں کی مجھ میں لگی ہے
نہیں پاس حسن عمل میرے مولیٰ
نظر میری تیرے کرم پر لگی ہے
عبید رضا نیکیوں سے ہے خالی
گناہوں میں حاصل اسے برتری ہے

(۳) نعت:

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت، تعریف وتوصیف، شمائل و خصائص اور کمالات واختیارات کے شعری اندازِ بیاں کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں نعت کے لیے لفظ''مدح النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' یا ''المداح النبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' استعمال ہوتا ہے۔ مگر اردو اور فارسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور خصائص جمیلہ بیان کرنے کو''نعت'' کہتے ہیں۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناء خواں کہا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابۂ کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ اولین نعت گو شعراء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب اور اصحاب میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ اسی بنا پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو''شاعر دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' بھی کہا جاتا ہے۔ ذیل میں آپ کے نعتیہ اشعار ہیں ؎

وأحسنُ منکَ لم تَرَ قَطُّ عَینی
وَاجمَلُ مِنکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاء
خلقتَ مبرء أمن کلِّ عیب
کانکَ قد خلقتَ کما تَشَاء

ترجمہ: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے حسین تر میری آنکھ نے کسی کو نہیں دیکھا، آپ جیسا حسین وجمیل کسی ماں نے جنا نہیں، آپ کو ہر عیب سے پاک پیدا فرمایا گیا، گویا آپ نے جیسا چاہا تھا ویسا ہی ہوا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کئی مرتبہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نعت سماعت فرمائی۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ہے، اُن صحابہء کرام کی کہ جنہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعتیں لکھیں اور پڑھیں۔ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے تشریف لائے تو آپ کے استقبال میں انصار کی بچیوں نے دف پر نعت پڑھی، جس کا درج ذیل شعر شہرتِ دوام پا گیا ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
و جبت شکر علینا ما دعا للہ داع

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت اسود بن سریع رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ، حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ اور حضرت نابغہ جعدی رضی اللہ عنہ نعتیں پڑھیں۔ صحابۂ کرام کے بعد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ، امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر اقبال، مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد عشاق کی اس صنف کو فروغ دے رہے ہیں۔ نعت میں ایسے مضامین لانے چاہیے جو نبی کریم ﷺ کی شان کے مطابق ہوں، جنھیں سننے اور پڑھنے کے بعد نبی کریم ﷺ کی عظمت، شان رفعت، بزرگی، کمالات اور اختیار سے واقفیت ہو اور دلوں پر روحانی واخلاقی اثرات مرتب ہوں ؎

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں
جس راہ چل دیے ہیں کوچے بسا دیے ہیں
ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آگئے ہیں سب غم بھلا دیے ہیں

(۴) منقبت:

لفظ''منقبت'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں لکھے ہوئے اشعار کو کہا جاتا ہے۔ مگر عرف عام میں اشعار کے ذریعے کسی بزرگ یا ولی یا برگزیدہ شخصیت کی تعریف کرنے کو منقبت کہتے ہیں۔ نواسۂ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں پروفیسر ڈاکٹر ادیبؔ رائے پوری کی منقبت بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

آیا نہ ہوگا اس طرح حسن و شباب ریت پر
گلشنِ فاطمہ کے تھے سارے گلاب ریت پر

جان بتول کے سوا کوئی نہیں کھلا سکا
قطرۂ آب کے بغیر اتنے گلاب ریت پر
عشق میں کیا لٹایئے، عشق میں کیا بچایئے
آلِ نبی نے لکھ دیا سارا نصاب ریت پر
جتنے سوال عشق نے، آلِ رسول سے کیے
ایک کے بعد اک دئے، سارے جواب ریت پر
پیاسا حسین کو کہوں اتنا تو بے ادب نہیں
لمسِ لبِ حسین کو ترسا ہے آب ریت پر
آل نبی کا کام تھا آل نبی ہی کر گئے
کوئی نہ لکھ سکا ادیبؔ ایسی کتاب ریت پر

(۵) غزل:

غزل کا لفظ غزال سے نکلا ہے اور غزال ہرن کو کہتے ہیں غزل ہرن کے گلے سے نکلنے والی اُس آواز کو کہا جاتا ہے جب وہ شیر کے خوف سے بھاگ رہی ہوتی ہے غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عشق ومحبت کا ذکر کرنا بھی بتایا گیا ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورت سے باتیں کرنا ہے یعنی غزل عشق ومحبت کی قلبی واردات کی ترجمان ہوتی ہے۔ اصطلاحِ شاعری میں غزل سے مراد وہ صنفِ نظم ہے جس کا ہر ایک شعر الگ مضمون کا حامل ہوا اور اس میں عشق و عاشقی کی باتیں بیان ہوئی ہوں خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی۔ لیکن آج کل غزل میں عشق و عاشقی کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی موضوع زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز فارسی زبان سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس کے عربی زبان سے تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ عربی صنف قصیدہ میں موجود تشبیب سے ہی غزل کی ابتداء ہوئی۔ غزل کے موضوعات میں بڑی وسعت اور رنگارنگی ہوتی ہے۔ غزل اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ اس کی مخصوص ہیئت ہوتی ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جیسے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی
(غالبؔ)

اس شعر میں ''اتر'' اور ''کر'' قافیہ ہیں اور ردیف ''گئی'' ہے۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے اور اس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

غزل کے پہلے شعر کو ''مطلع'' اور آخری شعر کو ''مقطع'' کہا جاتا ہے جس میں عام طور پر شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ غزل کا سب سے اچھا شعر ''بیت الغزل'' کہلاتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعوں کی ردیف اور ان کا قافیہ ایک ہوتا ہے۔ لیکن مطلع کے بعد کے اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بعض میں ایک سے زائد مطلع ہوتے ہیں۔ دوسرا مطلع ''مطلع ثانی'' کہلاتا ہے اس کے بھی دونوں مصرعوں میں ردیف وقافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک علاحدہ اکائی ہوتا ہے اور وہ معنوی اعتبار سے اپنے طور پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے اشعار سے معنوی ربط نہیں ہوتا لیکن بعض غزلوں میں دو یا تین ایسے مسلسل اشعار موجود ہوتے ہیں جن میں ربط مضمون اور خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے، ایسے اشعار ''قطعہ'' کہلاتے ہیں۔ بعض ایسی غزلیں ہوتی ہیں جن کے تمام اشعار میں تسلسل موجود ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ایسی غزل کو ''مسلسل غزل'' کہتے ہیں۔ غزل کے اشعار کی تعداد تین سے پچاس تک متعین کی گئی ہے لیکن عام طور پر سات، نو یا گیارہ یعنی طاق اشعار پر مشتمل ایک غزل ہوتی ہے۔

ہیئت یا شکل کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔ مطلع، قافیہ، ردیف اور مقطع۔

محمد قلی قطب شاہ، غواصیؔ، نصرتیؔ، ولیؔ، میرؔ، دردؔ، آتشؔ، ناسخؔ، غالبؔ، مومنؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، مجروحؔ، اور ناصر کاظمی وغیرہ اردو کے چند مشہور غزل گو شعرا ہیں۔

☆**بیت الغزل:** غزل کے سب سے بہترین شعر کو بیت الغزل کہتے ہیں۔

مثلاً: مجروح سلطان پوری کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆فرد: شاعری میں ایک اکیلے شعر کو فرد کہتے ہیں۔

☆**مصرع:** شعر کی ایک سطر کو مصرع کہتے ہیں۔

☆**مطلع:** کسی بھی غزل (شاعری) میں پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔غزل میں اگر پہلے ''مطلع'' کے بعد ''دوسرا مطلع'' بھی ہو، تو اسے ''حسن مطلع'' کہتے ہیں۔

☆**حسن مطلع:** مطلع کے فوراً بعد آنے والے شعر کو کہتے ہیں۔اسے زیب مطلع بھی کہا گیا ہے۔

☆**مقطع:** مقطع کے معنی قطع کرنے کے ہیں چونکہ شاعر اپنی شاعری کے اختتامی شعر میں اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اسی آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر نجف شیرازی کا مقطع دیکھیں ؎

جب سے دیکھا تجھے حال یہ ہے مرا
مجھ کو کہتا ہے پاگل زمانہ نجف

(۶) قصیدہ:

قصیدہ لفظ ''قصد'' سے مشتق ہے۔اصطلاحِ شاعری میں قصیدہ ایسی شاعری کو کہتے ہیں جس میں قصد یا ارادے سے کسی کی تعریف یا مذمت کی جاتی ہے۔تعریف ہو تو قصیدہ مدحیہ کہلاتا ہے اور مذمت ہو تو ہجویہ۔قصیدہ دراصل اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں اور باقی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں لیکن ردیف کی پابندی ضروری نہیں۔

اردو ادب میں قصیدہ فارسی سے داخل ہوا۔اردو میں مرزا رفیع سوداؔ اور ابراہیم ذوقؔ جیسے شعرا نے قصیدے کی صنف کو اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔قصیدہ ہیئت کے اعتبار سے غزل سے ملتا ہے بحر شروع سے آخر تک ایک ہی ہوتی ہے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری

مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔مگر قصیدے میں ردیف لازمی نہیں ہے۔قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے۔بعض اوقات درمیان میں بھی مطلعے لائے جاتے ہیں ایک قصیدے میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ ہے زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں۔اُردو اور فارسی میں کئی کئی سو اشعار کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔

قصیدہ کی شکل یا ہیئت اور موضوع دونوں کی نوعیت مقررہ ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں میں کسی ایک کی عدم موجودگی سے یہ صنف اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔غزل جیسی مقبول صنف اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''گاڑھا مغز''۔اس صنف سخن کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنے نادر و بلند اور پُرشکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں ممتاز ہے اور تمام اصناف میں اسے وہی اہمیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغزِ سر کو حاصل ہوتی ہے لہٰذا اسے مغز تصور کر کے ''قصیدہ'' نام دیا گیا ہے۔قصیدے کی زبان عموماً پُرشکوہ اور لہجہ بلند آہنگ ہوتا ہے۔قصیدہ میں الفاظ و تراکیب پُررعب اور باوقار ہو، تشبیہات واستعارات کا موزوں استعمال ہو، صنائع بدائع میں جدت طرازی، خیالات کی ندرت اور مبالغہ آمیزی ہو مگر غلو سے گریز بہتر ہے۔قصیدے میں غزل کے برخلاف خیالات اور مضامین مربوط ہوتے ہیں اس لیے اسے عنوانات سے مزین کیا جاتا ہے۔جیسے: ''در منقبت حضرت علیؑ''، ''در منقبت امام رضاؑ''، ''در مدح عالم گیر ثانی'' اور ''در مدح آصف الدولہ'' وغیرہ۔

قصیدے کو مختلف مناسبتوں سے مخصوص ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔جیسے:

⋆آخری لفظ کی مناسبت سے تقسیم:

(۱) لامیہ (۲) لافیہ (۳) میمیہ۔

⋆ظاہری شکل کے لحاظ سے:

(۱) تمہیدیہ (۲) خطابیہ (۳) وعظیہ (۴) مدحیہ (۵) ہجویہ (۶) بیانیہ (۷) بہاریہ (۸) عشقیہ۔

⋆تشبیب کے مطابق تقسیم:

(۱) بہاریہ (۲) عشقیہ (۳) حالیہ (۴) فخریہ (۵) دعائیہ۔

★اجزائے ترکیبی:

(۱)تشبیب(۲)گریز(۳)مدح(۴)عرضِ مطلب(۵)دعا۔

اس صنف میں متعدد شعرانے طبع آزمائی کی لیکن سب سے زیادہ شہرت مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ کے قصائد کو حاصل ہوئی۔ مصحفیؔ نے سوداؔ کو قصیدہ کا نقاش اوّل، زبان کا حاکم او ہجو کا بادشاہ قرار دیا ہے۔

سلاطین، امرا، عامرانہ حکومتوں اور نوابوں کی نوابی کے خاتمے کے بعد اب قصیدے کے لیے سازگار ماحول نہیں ہے۔ کیوں کہ اب برسراقتدار حکمراں اور وزراء شاعروں کی بجائے کالم نگاروں کی سرپرستی کرنے لگے ہیں۔ اب ہر اخبار میں کوئی نہ کوئی قلم کار کسی نہ کسی کی مدح اور قصیدہ خوانی کررہا ہے اس لیے رائج صنف کی حیثیت سے قصیدے جیسی اہم صنف کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

قصیدہ درمنقبت حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم

(مرزا اسداللہ خاں غالبؔ)

دہر جز جلو یکتائے معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم

صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ، آئینۂ حسنِ یقیں
کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں!
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواسِ قریں
مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
اَبداً پشتِ فلک خَم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرّشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رُسُل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لَوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!
جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول

کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفَسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

(۷) مرثیہ:

مرثیہ عربی لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے جس کے معنی بُکا اور بین کرنے کے ہیں۔ مرثیہ شاعری کی ایسی صنف کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کی وفات پر اظہارِ غم اور مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جائیں یعنی مرنے والے کے لیے رونا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔ یہ اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے۔ اس میں ابتدا ہی سے توجہ کی گئی۔ قدیم اردو یا دکنی کے کم و بیش تمام شاعروں نے مرثیے لکھے۔ مرثیہ کی صنف عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں آئی۔ لیکن اردو اور فارسی میں مرثیہ کی صنف زیادہ تر اہل بیت یا واقعہ کربلا کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی عظیم شخصیات کے مرثیے لکھے گئے ہیں۔ اُردو میں مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے بانی اپنے یہاں امام باڑوں میں مرثیہ خوانی کرواتے تھے۔ اردو کا سب سے پہلا مرثیہ گو دکنی شاعر'' ملا وجہی'' تھا۔ لکھنو میں اس صنف کو مزید ترقی ملی اور میر انیسؔ اور میر دبیرؔ جیسے شعرا نے مرثیہ کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ مرثیہ کا زیادہ استعمال واقعہ کربلا کو بیان کرنے میں ہوتا ہے۔ جدید تنقیدی

بصیرت کی رُو سے مرثیہ گوئی کو فن شاعری کا سب سے حساس اور کٹھن عمل قرار دیا گیا ہے۔ باریک بین افراد جانتے ہیں کہ کئی اصنافِ سخن پر فنی گرفت رکھے بغیر ایک فکر انگیز اور جاندار مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ شعر پر فنی گرفت کے ہمراہ جتنی فصاحتِ کلام، بلاغت، حسّاسیت اور علمی وفکری مواد پر دسترس کی ایک کامیاب مرثیہ نگار کو ضرورت ہوتی ہے اتنی سعی نقد کسی اور صنفِ سخن میں مطلوب نہیں ہوتی۔

عام طور پر مرثیے واقعات کربلا پر مبنی ہوتے ہیں اس میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ، آپ کے جاں نثاروں اور خانوادۂ حسین کی سیرت، شخصیت، کردار، جذبات، احساسات، اعزہ سے رُخصتی، میدان کارزار میں ان فدایانِ حسین کی آمد، آلات حرب و ضرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے کنارے پر دشمن کی فوج کے پہرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کے زخمی لاشوں پر بین وبکا وغیرہ۔ سوداؔ، انیسؔ اور دبیرؔ جیسے شعرا نے مرثیے کو جس بلندی پر پہنچایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اردو میں غیر مذہبی، شخصی اور قومی مرثیوں کی بھی کمی نہیں۔ شخصی مرثیوں میں حالیؔ، اقبالؔ، سرور جہاں آبادی، چکبستؔ اور صفیؔ لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے مختلف علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی وفات پر مرثیے لکھے ہیں۔

☆**قصیدہ کی اقسام:** (۱) شخصی (۲) قومی (۳) کربلائی۔

☆**اجزائے ترکیبی:** (۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) رزم (۷) شہادت (۸) بین۔

یہاں مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مرثیہ کے چند بند بطور نمونہ پیش ہے ؎

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہ کربلا
اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا
اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا

چادر نہ تھی وہ چہرہ پر آب وتاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفی
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
پانی کے واسطے نہ کروں گا میں التجا
منت کروں گا بھی تو سنیں گے تو نہ اشقیا
کم ظرف سنگدل ہیں یہ کیا رحم کھائیں گے
مجھ کو یقیں نہیں ہے کہ پانی پلائیں گے

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرّا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چپ ہوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھلایا نہ چپ ہوئے
گہوارے میں پھوپھی نے جھلایا نہ چپ ہوئے
رو رو کے سارے گھر کو رُلایا نہ چپ ہوئے
واں اشک بار تھے تو یہاں بے قرار ہیں

پانی کے تم سبھوں سے یہ اُمیدوار ہیں

گر میں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہ گار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہہ ، بے زبان، نبی زادہ، شیر خوار
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکاکے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا سو کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانک کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیرے جاں ستاں
جوڑا کماں میں تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبراکے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

(۸) شہرآشوب:

شہرآشوب فارسی،ترکی اور اردوادب کی ایک اہم صنف سخن ہے۔ایسی صنف جوغمِ جاناں سے آگےنکل کرغمِ دوراں کااحاطہ کرتی ہے۔گردشِ زمانہ،سلطنتوں،بادشاہوں،امیروں اور حکمرانوں کے سیاسی وقارکازوال،عوام وخواص کے معاشی حالات،پستی اور زبوں حالی،فوجوں کی شکست،درباروں اور محلوں کا اُجڑنا،معاشی کسادبازاری،مختلف پیشوں میں کاروبار کافقدان ،آمدنی اور کمائی میں کمی اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی گراوٹ،افسوس ناک حالات کاوقوع پذیرہونا،اقدارکاٹوٹنا،یہ صنف ایسی تمام صورتوں کا جائزہ لیتی ہے جوصنفی اورفنی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہرزندہ ادب کی طرح اپنے عہدکی عصری حسّیت کی عکاسی بھی کرتی ہےاوراپنے دورکی بدلتی ہوئی قدروں،بدلتے ہوئے ادواراور بنتے بگڑتے ہوئے حالات کی نہ صرف ترجمان ہوتی ہے بلکہ اس دورکی روح کواپنے اندرسمولیتی ہے۔

شہرآشوب اردوکی وہ کلاسیکی صنف سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی،معاشرتی اوراقتصادی بحران کی وجہ سےعوام وخواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیاہو یاایسی نظم جس میں کسی شہر یاملک کی اقتصادی یاسیاسی بےچینی کا تذکرہ ہو یاشہرکےمختلف طبقوں کی مجلسی زندگی کے پہلو کا نقشہ خصوصاً ہزلیہ،طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو''شہرآشوب'' کہلاتی ہے۔اردومیں شہرآشوب کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد ہرطرف زوال و ادبار کے مہیب سائے منڈلانے لگے۔چنانچہ جوصنف سخن فارسی اورترکی میں ذہنی انبساط کےحصول کے لیےمخصوص تھی وہ اردومیں سیاسی،معاشی اورمعاشرتی اختلاج کے بیان کا ذریعہ بن گئی۔اردوکی پہلی آشوبیہ نظم کامصنف میرجعفرزٹلی (متوفی ۱۷۱۲ء) ہےاس کے بعدشاکرناجی،ظہورالدین حاتم،مرزامحمدرفیع سوداؔاورمیرتقی میرؔوغیرہ کانمبرآتاہےاورآشوب گوئی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ءتک جاری رہتا ہے۔

ہے خاک جیسے ریگ رواں سب نہ آب ہے
دریائے موج خیز جہاں کاسراب ہے

روز شمار میں بھی محاسب ہے گر کوئی
تو بے حساب کچھ نہ کر آخر حساب ہے
اس شہر دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
منھ پر لیے نقاب تو اے ماہ کیا چھپے
آشوب شہر حسن ترا آفتاب ہے
کس رشک گل کی باغ میں زلف سیہ کھلی
موج ہوا میں آج نپٹ پیچ و تاب ہے
کیا دل مجھے بہشت میں لے جائے گا بھلا
جس کے سبب یہ جان پہ میری عذاب ہے
سن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول
غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
آتش ہے سوز سینہ ہمارا مگر کہ میرؔ
نامے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

(۹) واسوخت:

ایسے اشعار جو بطورِ مسدس، ترجیع بند یا ترکیب بند، معشوق سے جل کر اس کی شکایت، عشق کی برائی آئندہ کے لیے اپنی بے پروائی اور بیزاری میں لکھے جائیں۔ واسوخت میں شاعر خصوصیت کے ساتھ معشوق کی بے وفائی اور بے رُخی سے تنگ آ کر محبوب اور عشق سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کو اس اُمید پر جلی کٹی سناتا ہے کہ شاید وہ مائل بہ التفات ہوجائے اور عاشق کے شکووں کا مداوا کرے۔ چنانچہ عاشق مختلف حیلوں بہانوں سے معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر ستم شعاریاں باقی رہیں تو صبر کا دامن چھوٹ جائے گا اور وہ اس سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے گا ؎

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربند اصول وفا نہ تھے
لب پر ہے تلخی مئے ایام ورنہ فیضؔ
ہم تلخی کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

(۱۰) ریختی:

’’ریختی‘‘ مردوں کے ذریعہ عورتوں کی مخصوص زبان، محاورے اور روزمرہ میں عورتوں کے باہمی معاملات اور جنسی جذبات کے اظہار پر مبنی شاعری ہے جو غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے مگر اس کا انداز، طرز، لہجہ حتیٰ کہ زبان و بیان غزل سے قطعاً مختلف بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے مستزاد کی ہیئت میں بھی ریختی لکھی ہے۔

ریختی انیسوی صدی میں لکھنؤ کے خاص ثقافتی ماحول کی پیداوار تھی۔ اس کے اہم شاعروں میں یار علی جان صاحب، سعادت یار خاں رنگین، محسن خاں محسن اور انشاء اللہ خاں انشا شامل ہیں۔ آج یہ صنف تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ میر یار علی جان کا ایک ریختی کلام پڑھیے ؎

چنگیز خاں سے کم نہیں خوں خوار کا مزاج
دشمن کا ہو نہ جو ہے مرے یار کا مزاج
اے جانؔ دل حرام سے پرہیز کیا کرے
رہتا نہیں ہے قابو میں بیمار کا مزاج

(۱۱) پیروڈی:

پیروڈی لفظ پیروڈیا سے نکلا ہے۔جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔ایک ادبی طرز تخلیق جس میں کسی نظم یا نثر کی نقل کر کے مزاح کا رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔اصطلاح میں اس سے وہ صنف ظرافت (نظم ونثر) مراد ہے جو کسی کے طرز نگارش کی طرز اور نقل میں لکھی گئی ہو اور اصل نگارش کے الفاظ وخیالات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ مزاحیہ تاثرات پیدا ہو جائیں۔ بعض اوقات صرف ایک لفظ بدل دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک حرف یا حرکت کی تبدیلی سے بھی پیروڈی ہو جاتی ہے۔پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس نظم ونثر کی پیروڈی ہو وہ مشہور ومعروف ہو تا کہ قاری فوراً پہچان لے اور اس سے بھر پور حظ اٹھا سکے۔پیروڈی کو مضحکہ خیز لفظی تصرف یا لفظی نقالی بھی کہہ سکتے ہیں۔ابن انشا کی مشہور غزل ملاحظہ فرمائیں ؂

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا
اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹی محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا

ابن انشا کی اس غزل کی سعدیہ حریم نے بہت خوب پیروڈی کی ہے۔

کل رات نکلی تھی پولس شب بھر کیا پیچھا ترا
معلوم تھا سب کو مگر پکڑا نہ پر سایہ ترا
دھندہ کرے کوئی تو کیا ہر شئے پہ ہے قبضہ ترا
دفتر ترے، افسر ترے، موٹر تری، بنگلہ ترا

اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص کرتا ہے طلب بھولا ہوا قرضہ ترا

اردو ادب میں ابن انشاء کی تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' پیروڈی کی بہترین مثال ہے۔

(۱۲) گیت:

لغت میں گیت سے مراد ''راگ''، ''سرور'' اور ''نغمہ'' کے ہیں اس لیے گیت کو گانے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔اس کا گہرا تعلق موسیقی سے ہے اس لیے اس میں سُر اور تال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔گیت میں جذبات واحساسات اور خاص کر ہجر وفراق کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔موسیقی میں گیت سروں کی ایک ایسی لہر ہوتی ہے جس میں انسانی آواز بھی شامل ہو اور وہ گیت کے بول گائے۔گیت کو گایا جاتا ہے اور انسانی آواز جو کہ سُر میں ادا کی جاتی ہے، اس کے ساتھ آلات موسیقی کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔بعض گیت ایسے بھی ہیں جن میں آلات موسیقی کا استعمال ممنوع ہوتا ہے اور گیت کے تمام تر جزئیات انسانی آواز پر مشتمل ہوتے ہیں۔گیت کے بول عام طور پر شاعری پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کو ادا کرتے ہوئے سُر اور تال کا تمام تر احترام ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔گیت کو یا تو ایک ہی گائک (سنگر) گاتا ہے یا پھر مرکزی گلوکار کے ساتھ کئی دوسری آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں جو کہ سُر کو اٹھانے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شامل کی جاتی ہیں۔دوسرے گائک عام طور پر بار بار دہرائے جانے والے گیت کے بول ادا کرتے ہیں یا پھر مرکزی گلوکار کے ہم آواز سُروں کو جلا بخشتے ہیں۔فلمی صنعت کی وجہ سے اس صنف کو بہت شہرت ملی ہے۔

گیت کی کئی قسمیں ہیں جو کہ شاعری، آواز اور خطوں کی بنیاد پر درجہ بندی میں ڈھالی جاتی ہیں۔لطیف گیت، کلاسیکی گیت، پاپ گیت یا پھر لوک گیت۔اس کے علاوہ گیتوں کی درجہ بندی موسیقی کی صنف اور گیت کے مقصد کے تحت بھی کی جاتی ہے جیسے کہ ڈانس، ریپ، جاز، کنٹری وغیرہ۔

بہ طورِ مثال بیکلؔ اتساہی کا گیت ''میں کس کے گیت لکھوں'' سے دو بند ؂

صحرا صحرا من کا چرچا ، گلشن گلشن جنگ
میں کس کے گیت لکھوں
ڈالی ڈالی پھول پھول پر کروٹ لیں انگارے
شبنم شبنم ، پتّی پتّی ، شعلے بانہہ پسارے
سانسوں سانسوں قید ہے خوشبو ، آنکھوں آنکھوں رنگ
میں کس کے گیت لکھوں

بنجر بنجر جشنِ بہاراں ، کھیت کھیت ویرانے
جھونپڑیوں میں پیاس چھلکتی محلوں میں پیمانے
باہر باہر چم چم چمکے بھیتر بھیتر زنگ
میں کس کے گیت لکھوں

(۱۳) ہجو:

ایسا کلام یا ایسی نظم خواہ کسی بھی ہیئت میں ہو۔جس میں کسی کی مخالفت میں اس پر طنز کیا جائے یا اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اردو ادب میں میر کی ہجویات اور سودا کی ہجویات مشہور ہیں۔ پہلے ''ہجو'' کو قصیدے کے ضمن میں گردانا جاتا تھا مگر اب یہ اپنے لیے ایک علاحدہ شناخت بنا چکی ہے۔آج کل سیاسی جلسوں میں ہجو گو شعرا کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔مرزا محمد رفیع سوداؔ نے میر تقی میرؔ کی ہجو میں جو اشعار کہے ہیں وہ کامیاب اور فنکارانہ طنز کی بہترین مثال ہے۔نو اشعار کی اس ہجو میں جو واقعہ ہوا ہے اس کا انحصار آخری شعر پر ہے ؎

ہر ورق پر ہے میرؔ کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

اس میں فنی تعمیر اتنی منظم اور اشعار ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ اس آخری شعر کا وار یقینی ہو جاتا ہے۔بغیر سخت الفاظ استعمال کیے ایسی ہجو خود سودا نے دوسری نہیں کہی۔

ہیئت کے اعتبار سے تقسیم:

ہیئت کے لحاظ سے اردو شاعری کی سات قسمیں بتائی جاتی ہیں۔

(۱) مثنوی (۲) رباعی (۳) قطعہ (۴) مُسمّط (۵) ترکیب بند (۶) ترجیع بند (۷) نظم ☆ پابند نظم ☆ معریٰ نظم ☆ آزاد نظم (۸) سانیٹ (۹) ترائیلے (۱۰) ہائیکو (۱۱) نثری شاعری۔

(۱) مثنوی:

مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جو مسلسل ہو اور اس میں کوئی واقعہ یا داستان وغیرہ نظم یا رقم کی جاتی ہے اور رزمیہ، بزمیہ، صوفیانہ یا اخلاقی مضامین باندھے جاتے ہیں۔لفظ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔یہ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی دو، دو کیا گیا یا دو، دو کے ہے۔اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ دوسرے اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے۔مثنوی کے اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔چوں کہ ہر شعر کا قافیہ دوسرے اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اس لیے اس کو مثنوی نام دیا گیا ہے۔

مثنوی کی ابتدا ایران میں ہوئی۔شاہنامہ فردوسیؔ اور مثنوی مولانا روم فارسی کی بے مثال مثنویاں ہیں۔شاعری کی دیگر اصناف میں مثنوی کو اس کی بعض خوبیوں کی وجہ سے فوقیت اور برتری حاصل ہے۔چنانچہ حالیؔ کہتے ہیں: ''مثنوی سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے۔'' اُردو میں قدیم دکنی شعرائے کرام نے مثنوی کی داغ بیل ڈالی۔دکن میں سب سے پہلی مثنوی فخر الدین نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ملتی ہے۔قطب مشتری (ملا وجہیؔ)، گلشن عشق (نصرتیؔ)، علی نامہ (نصرتیؔ)، پھول بن (ابن نشاطیؔ)، سحر البیان (میر حسنؔ)، گلزار نسیم (دیا شنکر نسیمؔ) اور زہر عشق (شوقؔ لکھنوی) چند مشہور و معروف مثنویاں ہیں۔

دکن کے چند ممتاز مثنوی نگار شعرا میں اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق،

وجہیؔ، غواصیؔ، ابن نشاطیؔ، نصرتیؔ اور ہاشمیؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

شمالی ہند کے مشہور شعرا میں میرتقی میرؔ، خواجہ میر اثرؔ، میرحسنؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا شوقؔ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆**اجزائے ترکیبی:**(۱)پلاٹ(۲)کردار(۳)منظرنگاری(۴)واقعہ نگاری (۵)زبان اور طرزِ ادا۔

☆**مثنوی کی قسمیں:**(۱)توضیحی(۲)بیانیہ۔

☆**موضوع کے اعتبار سے قسمیں:**(۱)بزمیہ(۲)رزمیہ۔

(۲) رباعی:

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں۔ شاعرانہ مضمون میں رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے، پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرعے میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ اس کے موضوعات مقرر نہیں۔ اردو فارسی کے شعرا نے ہر نوع کے خیال کو اس میں سمویا ہے۔ رباعی کے آخری دو مصرعے خاص کر چوتھے مصرع پر ساری رباعی کا حسن و اثر اور زور کا انحصار ہے۔ چنانچہ علمائے ادب اور فصحائے سخن نے ان امور کو ضروری قرار دیا ہے۔ بعض نے رباعی کے لیے چند معنوی و لفظی خصوصیات کو بھی لازم گردانا ہے۔ عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ہیں۔ رباعی، ترانہ اور دوبیتی بعض نے چہار مصرعی، جفتی اور خصی بھی لکھا ہے۔ مولانا احمد رضاؔ کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں ؎

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ
اِن سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قران تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

(۳) قطعہ:

قطعہ شاعری کی ایک صنف ہے یہ چار مصرعوں پہ مشتمل ہوتا ہے۔ دو شعروں کے مجموعے کو قطعہ کہتے ہیں۔ اس کے پہلے مصرع میں قافیہ یا ردیف کی کوئی قید نہیں ہے لیکن دوسرے مصرعے میں قافیہ لازمی موجود ہوتا ہے اس کے بعد اگر ردیف بھی لگا دیا جائے تو مصنف کی مرضی ہے ورنہ ردیف کے بغیر بھی قطعہ کے اصول مکمل ہو جاتے ہیں لیکن قافیہ ضروری ہے پہلے دو مصرعوں کے بعد تیسرا مصرع آتا ہے اُس میں بھی قافیہ اور ردیف کی کوئی قید نہیں لیکن چوتھے اور آخری مصرع میں دوسرے مصرع کا ہم آواز قافیہ ضروری ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے کے مطابق اگر قافیہ کے ساتھ ردیف ہے تو وہی ردیف چھوتھے مصرعے میں قافیہ کے بعد اس طرح لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قطعہ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ پہلے دونوں مصروں میں قافیہ یا قافیے کے ساتھ ردیف لگایا جائے مگر تیرے مصرعے کو قافیہ اور ردیف سے آزاد رکھا جائے مگر آخری مصرعے یعنی چوتھے مصرع میں پہلے دو مصرعوں کا ہم آواز قافیہ اور وہی ردیف لگایا جاتا ہے۔ ذوقؔ کا ایک قطعہ بہ طور نمونہ ؎

اے ذوقؔ، بس نہ آپ کو صوفی جتایئے
معلوم ہے حقیقتِ ھُو حق جناب کی
نکلے ہوئے کدے سے ابھی منہ چھپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

(۴) مُسمّط:

مُسمّط عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنیٰ ہیں پروئی ہوئی اور جڑی ہوئی چیز۔ مسمط ایک صنائع لفظی بھی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ جب شاعر کسی شعر میں اصل قافیے کے علاوہ تین مسجع یا ہم وزن فقرے یا قافیے مزید نظم کرے تو اُسے صنعتِ مسمط کہتے ہیں۔

اصطلاح شعر میں اس سے مراد وہ نظم ہے جس کا ہر بند ایک مقررہ تعداد کے مصرعوں پر مشتمل ہو۔ایک بند میں تین مصرعوں سے لے کر دس مصرعوں تک ہو سکتے ہیں۔اس طرح مصرعوں کی گنتی کے لحاظ سے مسمط کی آٹھ قسمیں بنتی ہیں۔جن میں چار قسمیں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس عام طور پر مستعمل ہیں۔یعنی جن کا ہر بند باالترتیب تین، چار، پانچ اور چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور نظم ''مدوجزر اسلام'' مسدس ہیئت میں ہے جو ''مسدس'' حالی کے نام سے موسوم ہے۔اس طرح ڈاکٹر اقبال کی شہرہ آفاق نظمیں ''شکوہ اور جواب شکوہ'' بھی مسدس ہیئت میں ہیں۔ بیشتر مرثیے بھی اسی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔
''جواب شکوہ'' کے اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں ،طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پر نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گرو سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

(۵) ترکیب بند:

وہ نظم جس میں مسلسل چھ سے آٹھ شعر ہوتے ہیں۔ساتویں یا آٹھویں شعر کے دو مصرعے گرہ کے طور پر علاحدہ قافیہ کے لکھے جاتے ہیں جبکہ ہر بند کے قافیہ ور دیف مختلف ہوتے ہیں ؎

نمونے کے طور پر علامہ اقبال کی نظم ''طلوع اسلام'' سے ایک بند

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو،زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جن کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو ،جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے ، ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے !
جہانِ آب وگل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا،عدالت کا،شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(۶) ترجیع بند:

یہ بھی ترکیب بند کی طرح ہوتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں آخری گرہ کے شعر یا مصرعہ ہر بند میں بار بار دہرایا جاتا ہے جسے ٹیپ کا شعر کہتے ہیں جب کہ ترکیب بند میں ہر ٹیپ میں نیا شعر ہوتا ہے۔

ترجیع بند کی مثال میں مولانا جمیل الرحمن قادری کا ایک کلام ؎

نہ کیوں کر مدینے پہ مکہ ہو قرباں
کہ ہیں جلوہ گر اُس میں محبوبِ یزداں

برستے ہیں ہر وقت انوارِ سبحاں
ہے ہر ایک گوشہ وہاں کا گلستاں
عجب دل کشا ہے مدینے کی گلیاں
معطر ہیں یوں جیسے پھولوں کی کلیاں

وہ گلیاں جہاں پر ملک سر جھکائیں
وہ گلیاں کہ عاشق کے دل میں سمائیں
وہ گلیاں کہ ہیں جن کی پیاری ادائیں
کسی کو ہنسائیں کسی کو رلائیں
عجب دل کشا ہے مدینے کی گلیاں
معطر ہیں یوں جیسے پھولوں کی کلیاں

(۷) نظم:

نظم کا لفظ عام طور سے نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصناف شاعری کو بھی ''نظم'' ہی کہتے ہیں۔اس اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی اور دیگر اصناف شعری نظم کے تحت آتے ہیں۔اسی طرح شاعری کی محض ایک صنف کو بھی ''نظم'' کہتے ہیں جسے عام طور پر غزل کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔غزل کے برخلاف نظم کی ہیئت مخصوص نہیں ہوتی لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے کیوں کہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔نظیرؔ اکبرآبادی، محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ، اسماعیل میرٹھی، چکبستؔ، سرور جہاں آبادی، اقبالؔ، جوشؔ اور متعدد شعرا نے نظم نگاری کو فروغ دیا ۔

آدمی نامہ

از: نظیر اکبرآبادی

دنیا میں بادشا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال و قطب و غوث و وَلی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کے اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی
فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اردو نظم کی ہیئت کے اعتبار سے تین اہم قسمیں ہیں۔پابند نظم، نظم معریٰ اور آزاد نظم۔

☆ پابندنظم:

پابندنظم میں بحر وقافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔اس کے سارے مصرعے ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔اشعار میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔اس لیے اسے مقفیٰ نظم بھی کہتے ہیں بعض اوقات قافیہ کے ساتھ ردیف کا بھی التزام کیا جاتا ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے صرف پابندنظم ہی کا رواج تھا۔آج بھی معریٰ نظم اور آزادنظم کے ساتھ پابندنظم ہی زیادہ لکھی جاتی ہیں۔ڈاکٹر اقبال کی ساری شاعری پابندنظم میں ہے۔چنانچہ یہاں ڈاکٹر اقبال کی نظم ''لالہ صحرا'' کے اشعار دیے جارہے ہیں جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس طرح پابندنظم میں ایک ہی وزن اورقافیے کی پابندی کی جاتی ہے ؎

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی اک لذتِ یکتائی
غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم

سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

☆ معریٰ نظم:

معریٰ نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں وزن بھی ہوتا ہے اورارکانِ بحر کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔البتہ اس میں قافیہ اور ردیف سے کام نہیں لیا جاتا۔چوں کہ یہ نظم قافیہ سے عاری ہوتی ہے اس لیے اسے نظم معریٰ یعنی غیر مقفیٰ نظم کہتے ہیں۔یہاں اسماعیل میرٹھی کی نظم ''چڑیا کے بچے'' کے چند اشعار دیے جارہے ہیں ؎

دو تین چھوٹے بچے، چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں،سینہ سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے ،پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روزمرہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو

مندرجہ بالا اشعار میں ایک شعر کا قافیہ دوسرے سے مختلف ہے۔اس میں کسی قافیے کی پابندی نہیں کی جاتی۔

☆ آزادنظم:

مغربی ہیئت میں آزادنظم کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔اس میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی،بحر کی بھی پابندی نہیں ہوتی البتہ بحر کے ارکان اوراس کے اوزان یا صوتی

بندشوں کی پابندی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں جبکہ آزاد نظم میں ارکان بحر کی تعداد ہر مصرعے میں متعین نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آزاد نظم کا یہ اقتباس دیکھیے

ے

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد وزن

ان مصرعوں میں اول تو یہ کہ کسی قافیے کی پابندی نہیں ملتی اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام مصرعے ایک وزن میں نہیں ہیں۔ باالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم آزاد ایسی نظم ہے جس میں نہ قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ ہی بحر کی جس کی وجہ سے کوئی مصرعہ طویل ہوجاتا ہے اور کوئی مختصر۔

(۸) سانیٹ:

سانیٹ مغربی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے اور یہ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں پہلا بند بارہ مصرعوں پر دوسرا بند دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر چودہ مصرعوں کی پابندی ضروری ہے۔ اس میں قافیوں کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔

بہ طورِ مثال علیم صبا نویدی کا لکھا ایک نعتیہ سانیٹ ے

کون آیا ہے میرے دل میں آج
بھاگ نس نس کا نور آور ہے
ذات کتنی سرور آور ہے
میرے اندر ہے سرخوشی کا راج

آرزو کا سہاگ مہکا ہے
مسکراہٹ کی حکمرانی ہے
اوج پر چاہ کی جوانی ہے
زندگانی کا بھاگ مہکا ہے

مجھ میں اک نور ہے بہاریں ہیں
پھول ، کلیاں ، چمن چمن مجھ میں
رنگ و بو کا ہے بانکپن مجھ میں
رحمتوں کے حسیں نظاریں ہیں

میری قسمت ہے کتنی نورانی
مجھ میں اک روشنی ہے قرآنی

(۹) ترائیلے:

فرانسیسی شاعری کی ایک مقبول صنف ترائیلے ہے۔ یہ ایک طرح کا بند ہے۔ ایک ہی بند میں نظم مکمل ہوجاتی ہے۔ یہ آٹھ مصروں پر مشتمل نظم ہوتی ہے اس میں صرف دو قافیے

ہوتے ہیں اور اس کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔اس میں پہلا ،تیسرا، چوتھا، پانچواں ، ساتواں اور دوسرا، چھٹا، آٹھواں مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

بہ طورِ مثال رؤف خیر کا ایک ترائیلے ''ٹائم کیپسول'' ؎

بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
ہَوا و حرص بھلا کس کو آ سکے ہیں راس
بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بُو باس
ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تنسیخ
بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

(۱۰) ہائیکو:

یہ ایک قدیم جاپانی صنف ہے۔اس صنف کو اردو اور انگریزی سے اپنایا گیا ہے۔اس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں مصرعوں کے جملہ ارکان سترہ ہوں۔

بیکلؔ اتساہی کے دو ہائیکو بہ طورِ مثال ؎

بیکلؔ کھڑا دُوار پر
پھونک کے اپنے گھر کو خود ہی
جُرم دھرے سنسار پر

اب اپنے قانون میں
چور ، شاہ سب اک ہیں جیسے
بَن مطلب مضمون میں

(۱۱) نثری شاعری:

انگریزی کی ایک صنف prose poetry کی تقلید میں اردو میں اس صنف کو اپنایا گیا۔اس شاعری میں بحر ،ردیف ،قافیہ، وزن کی پابندی کی قید نہیں ہوتی ۔اس میں ایک آہنگ ضرور ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس میں ایک غنائی کیفیت اور شاعری کا رنگ نظر آتا ہے۔

(B) اصنافِ نثر

☆ نثر

نثر اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں وزن کا اہتمام نہ ہو،(وزن شاعری کا وصف ہے) دوسرے ابہام بھی نہ ہو کیوں کہ اگر ایک جملہ میں کئی معنوں ہوں تو یہ نثر کا عیب ہے۔نثر میں بات صاف طریقہ سے بیان کی جاتی ہے۔نثر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں حقیقت اور واقعیت ہو۔نثر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس سے وہ کام لیا جائے جو شعر میں آسانی سے ممکن نہ ہو۔نثر کی کئی اقسام ہیں۔

(۱) سادہ نثر:

اس نثر کو کہتے ہیں جس میں رعایت ومناسبات وغیرہ نہ ہوں بلکہ عام فہم اور آسان الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو۔مثلاً فورٹ ولیم کالج کے رائٹر میر امن کی باغ و بہار کا یہ اقتباس دیکھیے:

''بادشاہ کی عمر چالیس برس ہوگئی۔ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر، وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔بادشاہ دیکھ کے آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ ''افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر

وزبر کیا۔اتنا ملک جو لیا،اب تیرے کس کام آوے گا؟" آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑاوے گا تجھے تو پیغام موت کا آچکا،اگر کوئی دن جیے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔"(باغ وبہار،شروع قصہ سے،ص۷۷)

(۲) سلیس نثر:

لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے آسان نثر کو سلیس نثر کہتے ہیں اس میں رعایت لفظی کا استعمال بھی نہیں ہوتا۔خطوط غالبؔ اس کی بہترین مثال ہے۔نمونہ ملاحظہ ہو۔

"پیرومرشد! آپ کو میرے حال کی بھی کچھ خبر ہے۔ضعف نہایت کو پہنچ گیا،بینائی میں فتور پڑا،حواس مختل ہوئے،جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا،اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔"

(۳) مقفّٰی نثر:

ایسی نثر جس میں وزن تو نہ ہو لیکن قافیے کا اہتمام کیا گیا ہو۔کسی زمانے میں اس کا رواج تھا۔بلکہ ایسا جنون تھا کہ میرامن کی سادہ نثر کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرورؔ نے "فسانۂ عجائب" نامی مکمل کتاب لکھ دی جو مقفّٰی نثر کی بہترین مثال ہے،مثلاً:

"طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے،"قم باذنی" کا دم بھرتا ہے۔جسے دیکھا بقراط،سقراط،جالینوس زماں ہے۔اس معنی میں یہ خطہ رشکِ زمینِ یونان ہے۔میرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم برّ و بحر سرگرمِ ثنا ہوئے۔شاعر زباں داں ایسے کہ عُرفیؔ و خاقانیؔ کی غلطی بتائی،فردوسیؔ و انوریؔ کی یاد بھلائی۔شیخ امام بخش ناسخؔ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرہ کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقیں منسوخ ہوا۔فُصحائے شیراز واصفہاں اس سیف زباں کا جو ہر دیکھ کے لوہا مان گئے۔اپنے فتح پر منفعل ہوئے،اس زبان کا حسن جان گئے۔زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا،سیکڑوں کو اُستاد بنایا۔خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی،شرر افشانی سے دل جلوں کے سینے میں

سوز و گداز ہے۔مرزا قانع شاعر ممتاز ہے۔"(ص ۱۳)

(۴) مسجّع نثر:

مسجّع ایسی نثر کو کہتے ہیں جس کے دو جملوں کے تمام الفاظ ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں اور آخر کے الفاظ بھی ہم قافیہ ہوں اور کبھی ردیف کا بھی استعمال ہو۔مثال:

"پونڈا پھیکا اتنا برا کہ جس کی برائی بیان سے باہر ہے،پونڈا میٹھا ایسا بھلا کہ اس کی بھلائی گمان سے بڑھ کر ہے۔"(دریائے لطافت،سید انشا)

اس مثال میں دو جملے ہیں۔پہلے جملے میں "پونڈا پھیکا اتنا برا" اور دوسرے میں "پونڈا میٹھا ایسا بھلا" ہم وزن جب کہ "جس کی برائی بیان سے باہر" اور "اس کی بھلائی گمان سے بڑھ کر" ہم وزن ہیں۔برائی،بھلائی،بیان،گمان،باہر،بڑھ کر ہم قافیہ الفاظ ہیں۔

(۵) رنگین نثر:

ایسی نثر کو کہتے ہیں جس میں صنائع لفظی و معنوی سے کام لیا گیا ہو۔مثلاً:

"بندہ حرارت قلب کے عارضے سے حیران و ششدر رہتا ہی تھا،اب ضعف دماغ کی بیماری نے اور بھی عاجز اور زچ کر دیا ہے۔ہر دم یہی سوچ اور منصوبہ آتا تھا کہ کدھر جاؤں اور کون ایسی چال چلوں کہ یہ عارضہ بڑھنے نہ پائے۔بارے ان دنوں حکیم شاہ رخ مرزا صاحب اس شہر میں وارد ہوئے،ان کی تعریف بہت سنی تھی کہ ان کے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور فقیر مسکین اور امیر فیل برابر ہیں۔مریضوں کی خبر گیری کے واسطے بارہ دری میں شطرنجی بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

اس نمونے میں بہت سارے الفاظ شطرنج کے مناسبات سے تعلق رکھتے ہیں۔مثلاً قلب، زچ،منصوبہ،کدھر جاؤں،چال چلوں،بڑھنے نہ پائے،بادشاہ،وزیر،امیر،فیل نشین وغیرہ۔یہ صنائع بدائع کا استعمال ہی اسے خوبصورت اور رنگین بناتا ہے۔

ذیل میں اصناف نثر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) افسانوی نثر

(۱) داستان:

داستان اردو افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ واقعات کو قوت متخیلہ کے سہارے بیان کرنے ہی کو فسانہ گوئی کہتے ہیں۔ اگرچہ فسانہ کے لغوی معنی جھوٹی اور فرضی کہانی کے ہیں۔ داستان بنیادی طور پر سننے سنانے یعنی بیان کا فن ہے۔ اس کے موضوعات میں عشق اہم ترین موضوع ہے۔ داستانیں تحریری شکل میں آنے سے قبل سنائی جاتی تھیں۔ داستان گوئی کی گذشتہ صدیوں میں محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ داستان گو داستان بیان کرتا تھا۔ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی افراط تھی، غم روزگار سے بے نیاز تھے، فکرِ آخرت سے آزاد تھے۔ اس لیے اپنی تفریح کا سامان داستانوں سے فراہم کرتے تھے۔ داستان گو واقعات کو اپنے تخیلات سے اس حد تک دل چسپ بنادیتے تھے کہ سامعین حیرت واستعجاب کے فضا میں غرق ہوجاتے تھے۔ داستان اور داستان گو کی کامیابی اسی میں تھی کہ وہ سامعین کی دل چسپی اور توجہ کو قائم رکھے، وہ داستان میں ایسے ناقابل یقین واقعات کو شامل کرتا تھا جو سامعین کے عالم خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ قصہ میں حسن وعشق کی خوش نمائیوں، خیر وشر کی لڑائیوں اور مافوق الفطرت عناصر کو شامل کرکے حیرت واستعجاب کی فضا پیدا کرکے پیش کرنے کا نام داستان ہے۔

☆**عناصر ترکیبی:** (۱) طوالت (۲) پلاٹ (۳) کردارنگاری (۴) مافوق الفطرت عناصر (۵) منظرنگاری (۶) اسلوب۔

(۲) ناول:

ایک خاص طوالت کا نثری قصہ ناول ہے۔ ہنری جیمس نے ناول کی تعریف یوں کی ہے: ''ناول اپنی وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست اثر ہے۔''

کلاریوز کے کہنے کے مطابق: ''روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہونے والے واقعات کو مانوس اور مربوط انداز میں پیش کرنے کا نام ناول ہے۔''

ورجینا وولف نے ناول کی اہم خصوصیات کا احاطہ یوں کیا ہے: ''ناول انسانوں کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے اندر ایسے ہی احساسات اُبھارتے ہیں جیسا کہ حقیقی دنیا میں ابھارتے ہیں۔ ناول فن کی وہ واحد ہیئت ہے جس کی واقعیت ہم کو یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے یعنی وہ حقیقی انسان کی زندگی کا بھرپور اور صداقت شعارانہ ریکارڈ پیش کرتا ہے۔''

ڈیوڈ سیسل ناول کو ایسا فنی کارنامہ قرار دیتا ہے جو ہم کو ایک ''زندہ دنیا'' سے متعارف کرتا ہے۔ لیکن یہ دنیا ہماری اپنی دنیا سے ''مشابہ'' بھی اور اپنی ایک ''الگ انفرادیت'' بھی رکھتی ہو۔

☆**اجزائے ترکیبی:** (۱) کہانی (۲) پلاٹ (۳) کردار (۴) مکالمے (۵) پس منظر یا زماں ومکاں (۶) اسلوب (۷) نقطۂ نگاہ۔

(۳) افسانہ:

افسانہ انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ افسانہ قصہ کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں ''شارٹ اسٹوری'' کا نام استعمال ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے ''فکشن'' کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ بے شمار تعریفوں کے سبب افسانے کی کوئی ایک مخصوص تعریف بے حد مشکل ہے۔ عام طور پر فرضی کہانی کو افسانہ کہا جاتا ہے جو حقیقت کے قریب ہو اور زندگی کی عکاس ہو۔ کیوں کہ اسے زندگی کا ایک ادبی نقش قرار دیا جاتا ہے۔ فنی لحاظ سے ایک افسانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحدت تاثر کا حامل ہو۔ وحدت تاثر قائم کرنے کے لیے افسانے میں صرف ایک مقصد پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر مقاصد ایک سے زیادہ ہوں تو افسانے

میں بہت سی فنی خرابیاں پیداہوجاتی ہیں۔اختصار افسانہ کی خوبی ہے۔اڈگرالین پو(Adgaralinpoe) کاقول ہے کہ افسانہ وہ مختصر کہانی ہے جوآدھ گھنٹہ سے لے کرایک گھنٹہ یادوگھنٹہ کے اندر پڑھی جاسکے۔بعض نے کہا کہ ایک نشست میں پڑھا جاسکےغرضیکہ افسانہ مختصر مگر معنوی اعتبار سے جامعیت کا شاہکار ہونا چاہیے۔

اردو افسانے کا آغاز منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے ہوا مگر بعض نقاد سرسید احمد خان کواردو کا پہلا افسانہ نگار اوران کی تحریر ’’گزرا ہوا زمانہ‘‘ کو پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں جو ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خان نے لکھا تھا۔

☆**اجزائے ترکیبی:**(۱)پلاٹ(۲)کردارنگاری(۳)زمان ومکان (۴) وحدت تاثر (۵) موضوع(۶)اسلوب۔

☆**اسلوب کی اقسام:**(۱)بیانیہ(۲)سوانحی(۳)مراسلاتی(۴)مخلوط(۵)یادداشتی۔

(۴) ڈرامہ:

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کی رو سے لفظ ڈراما اس یونانی لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں’’کرکے دکھائی ہوئی چیز‘‘۔بوطیقا میں ارسطو نے ڈرامے کی کوئی باقاعدہ تعریف پیش نہیں کی مگر اس سلسلے میں پیش کی گئی اس کی توضیحات سے ڈرامے کی تعریف اس طرح مرتب کی جاسکتی ہے۔

’’ڈراما انسانی افعال کی ایسی نقل ہے جس میں الفاظ کی موزونیت اور نغمے کے ذریعے کرداروں کو محوگفتگو اور مصروف عمل ہو بہو ویسا ہی دکھایا جائے جیسے کہ وہ ہوتے ہیں یا ان سے بہتر یا بدتر انداز میں پیش کیا جائے۔‘‘(ترجمہ عزیز احمد،ایم اے اردو سال دوم،ساتواں پرچہ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی،ص/۱۰۸)

یوں تو مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے ڈرامے کی متعدد تعریفیں پیش کی ہیں۔جس کا نچوڑ یہ ہے۔’’کسی قصے یا واقعے کو کرداروں کے ذریعے تماشائیوں کے روبرو پھر سے عملاً پیش کرنے کو ڈراما کہتے ہیں۔‘‘

محققین کی ایک بڑی تعداد نواب واجد علی شاہ کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار اوران کے ڈرامہ

’’رادھا کنہیا‘‘ کو اردو کا پہلا ڈرامہ مانتے ہیں۔جب کہ بعض نقاد ’’علی بابا چالیس چور‘‘(۱۸۵۲ء) کو پہلا ڈرامہ اور کیپٹن گرین ادے کو پہلا ڈرامہ نگار مانتے ہیں۔حبیب تنویر،مرزا محمد ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر،امتیاز علی تاج،خواجہ احمد عباس،عصمت چغتائی،منٹو،آغا حشر کاشمیری،پروفیسر محمد مجیب،راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔

☆**اجزائے ترکیبی:**(۱)پلاٹ(۲)کردار(۳)مکالمہ(۴)زبان(۵)موسیقی(۶)آرائش۔

☆**اقسام:**(۱)ٹریجیڈی(۲)کامیڈی(طربیہ)(۳)ٹریجیڈی کامیڈی (الم طربیہ) (۴) میلوڈرامہ(۵)فارس(۶)ڈریم(۷)اوپیرا۔

(ب) غیرافسانوی نثر

(۱) مضمون:

کسی بھی عنوان پر معلومات یکجا کرکے اس کے ذیلی موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے دل چسپ اور جامع موادکو ترتیب،تسلسل اور روانی کے ساتھ پیش کرنا یا کسی موضوع پر ترتیب کے ساتھ اظہار خیال کرنا’’مضمون‘‘ کہلاتا ہے۔مضمون کو تین اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱)تمہید جس میں موضوع کا تعارف کروایا جاتا ہے۔

(۲)نفس مضمون جس میں موضوع کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

(۳)خاتمہ۔

مضمون میں ادب، سائنس، مذہب،ٹکنالوجی، امراض، علاج، سیاست، سماج، معاشرت غرض کہ ہر موضوع پر خیالات کا اظہار ہوسکتا ہے۔مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کرکے اکثر اسے ایک ہی نشست میں مطالعہ کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔اردو میں مضمون نگاری کی روایت انگریزی ادب کی دین ہے۔چنانچہ 1824ء میں جب دلّی کالج قائم کرکے انگریزوں نے علوم وفنون کی ترقی پر توجہ دی تو اس کالج سے وابستہ ماسٹر رام

چندر نے سب سے پہلے ''مضمون نگاری'' کی بنیاد رکھی جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ماسٹر پیارے لال اور پھر شمس العلماء ذکاء اللہ نے ''مضمون نگاری'' کی روایت کو فروغ دیا۔سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔موضوعات کے لحاظ سے مضامین کی کئی قسمیں ہیں جیسے علمی مضامین، ادبی مضامین، تاریخی مضامین، سیاسی مضامین، معاشی مضامین، معاشرتی مضامین، سائنسی مضامین، تنقیدی مضامین اور تحقیقی مضامین وغیرہ۔

(۲) انشائیہ:

مضمون کا ایک ایسا ہلکا پھلکا انداز جس میں بے ساختہ بے تکلفانہ کسی موضوع پر اظہار خیال کیا جائے تو اسے انشائیہ قرار دیا جاتا ہے۔انشائیہ کے لیے انگریزی میں Essay کا لفظ رائج ہے۔انشائیہ میں مضمون کی خصوصیات نہیں ہوتیں بلکہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں اپنی تحریر کا موضوع بناتا ہے جس کی وجہ سے مضمون اور انشائیہ میں موجود فرق کو محسوس کرنا آسان ہوجاتا ہے۔دکنی میں لکھی گئی ملا وجہی کی نثری کتاب ''سب رس'' کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش اس میں موجود ہیں۔محمد حسین آزاد کو بعض محققین پہلا انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہیں جن کے انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگ خیال'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ انگلستان کے سفر کے بعد سرسید احمد خاں کی تحریروں سے اس صنف کا باقاعدہ آغاز ہوا جس کا مطالعہ انھوں نے لندن کے اخبارات اور انگریزی رسالوں میں کیا تھا۔رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید کے ایسے بے شمار مضامین ہیں جن میں بے تکلفی، بے ساختہ پن اور فکر کی گہرائی موجود ہیں۔''مضامین سرسید'' کے نام سے سرسید کے انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔سرسید کے بعد نذیر ناصر، فراق دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور دوسرے قلم کاروں نے انشائیہ کی صنف میں مزید اضافے کیے۔

(۳) خطوط یا مکتوب:

مکتوب نگاری دو انسانوں کے مابین تعلقات کی ترجمانی کرنے والی ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس میں غیر افسانوی انداز میں خیالات کی ترسیل ہوتی ہے اور حقیقت حال کا بیان ہوتا ہے۔ ماضی میں جو لوگ فاصلوں پر رہتے تھے، تبادلۂ خیالات اور خیر خیریت جاننے کے لیے بے چین رہتے تھے، ان لوگوں کے آپسی تبادلۂ خیال کا ایک ہی ذریعہ ''خط'' تھا۔مختلف النوع جذبات، احساسات، خیالات اور اطلاعات تحریر کر کے اس کی ترسیل کا انتظام کرنا مکتوب نگاری کی خصوصیات ہیں۔اردو کے بیشتر مصنفین اور ادیبوں کے خطوط ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز مرزا غالبؔ کے خطوط سے ہوا۔ مرزا غالبؔ نے اردو کے ابتدائی خطوط 1846ء میں تحریر کیے۔اس سے قبل فارسی میں مکتوب نگاری کا چلن عام تھا۔مرزا غالبؔ کے بعد اس صنف نے کافی ترقی کی۔چنانچہ مولانا حالی، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نامور ادیبوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو میں مکاتیب نگاری کی صنف قدیم اور توانا ہے۔دورِ حاضر میں ترسیل کے نئے ذرائع پیدا ہو چکے ہیں اس لیے خطوط نگاری میں کمی واقع ہوئی ہے مگر اس کی اہمیت اب بھی مسلّم ہے۔

⋆خط کے اجزا:

(۱) مکتوب نویس کا نام اور پتہ (۲) تاریخِ تحریر (۳) نشان مجاریہ (۴) مقدمہ یا سبجیکٹ (۵) حوالہ نشان (۶) القاب (۷) آداب (۸) نفسِ مضمون (۹) خاتمہ (۱۰) مکتوب نویس کے دستخط (۱۱) مکتوب الیہ کا نام اور پتہ۔

⋆خطوط کی قسمیں:

(۱) نجی اور ذاتی خطوط (۲) دفتری/حکومتی خطوط (۳) کاروباری/تجارتی خطوط (۴) اخباری خطوط/مراسلے (۵) ادیبوں اور دانش وروں کے خطوط۔

(۴) سوانح:

کسی بھی نامور شخص کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا فن سوانح کہلاتا ہے۔سوانح میں کسی مشہور شخص کی زندگی کے محاسن اور معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔سوانح میں مستند اور جامع مواد کی پیش کشی ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جارہی ہے اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو کتاب میں سلسلہ وار بیان کردیا جائے۔اگر کتاب میں صرف محاسن وکمالات بیان کیے جائیں تو ایسی سوانح ادبی معیارات کی تکمیل نہ کرسکے گی۔سوانح میں نہ تو شخصیت کے بارے میں فرضی واقعات بیان کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیز اسلوب۔مولانا الطاف حسین حالی کو اردو کا اولین اور سب سے بہترین سوانح نگار کا درجہ حاصل ہے۔انہوں نے سب سے پہلے شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی حیات پر ''حیات سعدی'' اس کے بعد مرزا غالبؔ پر ''یادگار غالب'' اور آخر میں سرسید احمد خاں پر ''حیات جاوید'' لکھ کر اردو ادب میں سوانح کی بنیاد رکھی۔

(۵) خودنوشت سوانح:

خودنوشت سوانح ایک غیر افسانوی صنف ہے جس میں کوئی شخص اپنے حافظہ کے بل بوتے پر اور کسی طرح کا کوئی موجود ہوتو اس سے استفادہ کرکے شخصی تاثرات کے ساتھ اپنی سوانح حیات ترتیب دیتا ہے۔اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے حالات بقلمِ خود تحریر کرے اور حقائق کی روشنی میں حالات پیش کرے تو ایسی تحریر خودنوشت سوانح قرار دی جاتی ہے۔خودنوشت سوانح ایک ایسا فن ہے جس میں انسان اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نقطۂ نظر اور اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرسکتا ہے۔خودنوشت سوانح ساری زندگی کے حالات پر محیط کتابی شکل میں پیش ہوسکتی ہے یا چند قابل ذکر واقعات کے ساتھ ایک مضمون کی شکل میں۔

خودنوشت سوانح اور آپ بیتی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ آپ بیتی کسی مخصوص واقعہ یا حالات کی نمائندہ ہوتی ہے اور خودنوشت میں پیدائش سے لے کر سوانح قلمبند کرنے کے دور تک کے تفصیلی حالات کا ذکر ہوتا ہے۔ہندوستان کی آزادی میں حصہ لینے والے بیشتر سیاسی رہنماؤں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات تحریر کی اور آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔گاندھی جی نے اپنی خودنوشت سوانح ''My LIfe and Experiments with Truth'' انگریزی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ ''تلاش حق'' کے زیر عنوان کیا گیا۔

(۶) دیباچہ:

کتابوں کے ابتدائی صفحات میں مصنف کی شخصیت یا فن کے تعارف کے طور پر جو تحریریں شامل کی جاتی ہیں اسے دیباچہ کہتے ہیں۔عموماً دیباچہ کسی مشہور قلم کار یا دانش ور سے لکھوایا جاتا ہے۔لیکن کبھی خود مصنف اپنے یا اپنی کتاب کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتا ہے،اس تحریر کو دیباچہ،تقریظ یا پیش لفظ کا عنوان دیا جاتا ہے۔تصنیف وتالیف کے ابتدائی دور میں تقریظ نگاری کا طریقہ عام تھا جس میں کتاب لکھنے والے کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔اس کے بعد پیش لفظ اور دیباچہ نویسی کا چلن عام ہوا جس کے ذریعے نہ صرف کتاب اور مصنف کو متعارف کیا جاتا ہے بلکہ کتاب کے نمایاں خدوخال کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔اب پیش لفظ یا دیباچے کو نئے نئے عنوانات کے تحت لکھا جارہا ہے۔اختصار کے ساتھ حقیقت پسندانہ خیالات پیش کرنے کے علاوہ نکتہ آفرینی اور مصنف کی بعض قابلِ ذکر ودلچسپ خصوصیات کے تذکرے کی وجہ سے دیباچہ نویسی کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔

گویا کہ دیباچہ نویسی ایک ایسا فن ہے جس میں تنقید وتحقیق کی بجائے کتاب کے متن سے قبل ایک تاثراتی مضمون شامل کیا جاتا ہے۔تنقیدی یا تحقیقی نوعیت کے دیباچے بھی لکھے جاتے ہیں۔روایت ہے کہ دیباچے میں تنقیدی وتحقیقی انداز اختیار کیا جائے تو اکثر اسے مقدمہ کا نام دیا جاتا ہے۔جو دیباچے خالص تنقیدی نوعیت کے ہیں ان کا ذکر تنقید کی صنف

میں ہوگا، جیسے خواجہ الطاف حسین حالی کی مشہور زمانہ مسدسِ حالی کا دیباچہ۔جس کے بعد مقدمہ کے زیرِعنوان تنقیدی دیباچے لکھے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز دراز ہے۔تاہم تاثراتی اور تعارفی دیباچے بھی مقدمہ کے عنوان سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔اردو میں دیباچہ تحریر کرنے کی روایت کا آغاز مرزا محمد رفیع سودا نے کیا۔ان کے کلیات کا دیباچہ اردو میں لکھا گیا تھا۔جنوبی ہند کے بعض محققین کے بموجب مرزا محمد رفیع سودا سے قبل مدراس کے ایک اہم ادیب محمد باقر آغا ویلوری نے سب سے پہلے اردو میں دیباچہ نویسی کی بنیاد رکھی۔

(۷) سفرنامہ:

اردو میں داستانوی سفرناموں کی روایت عام تھی۔ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سفرناموں میں حقائق پر مبنی واقعات، تجربات، مشاہدات اور چشم دید مناظر کا ذکر کیا جانے لگا۔بادشاہوں کے خاص مقربین نے روزناموں اور ڈائریوں کی شکل میں سفرنامے لکھے۔روایتی قصے کہانیوں سے گریز کرتے ہوئے حقائق کی پیش کشی کی وجہ سے ''سفر نامہ'' کو غیر افسانوی صنف ادب میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔تجارت، حصولِ علم، تبلیغِ دین، جہاں بانی، سیاسی مقاصد، تلاشِ معاش، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور اس نوعیت کے کتنے ہی مقاصد ہیں جن کے لیے انسان سفر کرتا رہا اور سفرنامے تحریر کرتا رہا ہے۔

اردو میں سفرنامے کی روایت کا آغاز 1847ء میں ہوا جب کہ محمد یوسف خاں کمبل پوش نے ''عجائبات فرنگ'' لکھی۔اس کتاب میں سفرِ انگلستان کے دل چسپ حالات بیان کیے گئے ہیں۔اس کے بعد سرسید احمد خان نے ''مسافران لندن'' اور شبلی نعمانی نے ''سفرنامہ مصر و روم و شام'' تحریر کیا جنہیں اردو کے ابتدائی سفرناموں کا موقف حاصل ہے۔سفرناموں میں داستان کی داستان طرازی، ناول کی فسانہ طرازی، افسانے کی چونکا دینے والی کیفیتیں اور ڈراما کی منظر کشی ملتی ہے یعنی فکشن کی تمام اصناف کے اوصاف سفرناموں میں ملتے ہیں۔کرنل محمد خاں کی خودنوشت سوانح ''بجنگ آمد'' سفرنامے کے انداز

پر لکھی گئی۔جدید ترین سفرناموں کا رجحان شگفتہ بیانی سے عبارت ہے۔آج کے سفرنامے گائیڈ بُک نہیں بلکہ ادب اور سیاحت کا حسین ترین اظہار بن گئے ہیں۔ابن انشا، ممتاز مفتی، مستنصر حسین تاڑڑ، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے سفرنامے مشہور ہیں۔

(۸) آپ بیتی:

خود پر بیتے ہوئے حالات کے ذکر کو آپ بیتی کہتے ہیں۔بن باس کی زندگی، قید کے حالات، نظر بندی کے دور کے حالات اور واقعات کا ذکر بھی آپ بیتی کے ذریعے ممکن ہے۔فنی اعتبار سے آپ بیتی ایک ایسی تحریر ہے جس میں خود پر گزرے ہوئے اچھے اور برے حالات کے علاوہ صدمات اور تاثرات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔آپ بیتی لکھنے والے اپنے حالات اور دل چسپ واقعات کے تانے بانے میں تاثرات کو گوندھ کر خودنوشت کا مواد تیار کرتے ہیں۔گویا کہ آپ بیتی میں نہ قصہ کہانی کا ذکر ہوتا ہے اور نہ ہی فرضی واقعات کا بیان ممکن ہے۔اردو نثر میں آپ بیتی ایک ایسی صنف ہے جو ہر دور میں رائج رہی اور آج بھی اس کا سلسلہ دراز ہے۔1857ء کے غدر کے دوران ہندوستان کے باشندوں پر جو مصائب گذرے انہیں ''آپ بیتی'' کی صورت میں بیان کیا گیا۔علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ نے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں رہتے ہوئے ''الثورۃ الہندیہ'' (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔''الثورۃ الہندیہ'' اور'' قصائد فتنۃ الہند'' (منظوم) کو علامہ خیرآبادی نے قید تنہائی سے 1860ء میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس کوئلہ اور پنسل سے کپڑا وغیرہ لکھ کر بحفاظت تمام بھیجا تھا۔اس کتاب پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تعارف لکھا اور مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے 1946ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا۔محمد جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی'' کو اردو کی اولین آپ بیتی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔

(۹) خاکہ:

انگریزی ادب میں خاکہ کے لیے Sketch کا لفظ مروج ہے۔خاکہ کے معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں اور خاکہ کے لیے اردو میں مرقع، شخصی مرقع، چہرہ بشرہ، قلمی تصویر اور جیتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ادبی اصطلاح میں خاکہ سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں مبالغے کے بغیر اس طرح پیش کرنا کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجائے اور اس کے افکار وخیالات بھی اُبھر کر سامنے آجائیں۔خاکہ درحقیقت ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔خاکہ میں کسی ایک شخصیت کی زندگی کے اہم نکات کی دل چسپ انداز میں نشاندہی کی جاتی ہے۔خاکہ نگاری میں طویل سوانح سے زیادہ دل چسپ مواد پیش ہوتا ہے اور ویسے بھی اختصار نویسی کے اس دور میں خاکے کو سوانح پر توجیح دی گئی ہے۔خاکہ نگار شخصیت کی مرقع کاری کا کام انجام دیتا ہے۔خاکہ میں شخصیت کے منفی اور مثبت دونوں رویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔کہا گیا کہ خاکہ نگاری ایسا فن ہے جس میں نگینہ چننے کا کام انجام دیا جاتا ہے۔اردو میں خاکہ نگاری کے ہلکے نقوش سب سے پہلے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب ''آب حیات'' میں خاکہ کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کو اردو کی پہلی طویل خاکہ نگاری کی کتاب قرار دیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق کی تصنیف ''چند ہم عصر'' اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نمونوں میں سے ہے۔رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ''، شاہد احمد دہلوی نے ''دلّی کی اہم شخصیتیں''، اشرف صبوحی نے ''دلّی کی عجیب وغریب شخصیتیں'' لکھ کر خاکہ نگاری کو فروغ دیا۔

(۱۰) رپورتاژ:

کسی جلسہ، محفل، کانفرنس، سمپوزیم، مشاعرہ یا اس نوعیت کی دیگر تقاریب کی مکمل کاروائی قلم بند کی جائے تو اسے روداد کہتے ہیں۔لیکن کوئی ادیب اسی تفصیل کو ادبی چاشنی کے ساتھ چشم دید واقعات کے طور پر شخصی تاثرات شامل کر کے، پوری دل چسپیاں پیدا کرتے ہوئے بیان کرے تو اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔بنیادی طور پر رپورتاژ ادبی اور فنی خصوصیات سے مالا مال مضمون ہوتا ہے۔رپورتاژ نگار علمی وادبی جولانی کے ساتھ ادب کے اہم نکات کو شامل کر کے ایسی دل چسپ رپورٹ تیار کرتا ہے جس میں باریک بینی اور بذلہ سنجی کو بھی دخل ہوتا ہے۔اردو میں سب سے پہلے کرشن چندر نے ''پودے'' لکھ کر رپورتاژ نگاری کی بنیاد رکھی۔کرشن چندر کے بعد اردو کے بیشتر ترقی پسند تحریک کے قلم کاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور دورِ حاضر میں بھی اس صنف کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

(۱۱) طنز ومزاح:

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے الفاظ میں: طنز، شعری یا نثری وہ تخلیق ہے جس میں روزمرہ کی کمزوریوں یا بے وقوفیوں کا کبھی کبھی کچھ حقیقتوں کے ساتھ مذاق اڑایا جاتا ہے۔اس کا مقصد کسی فرد خاص یا افراد کے گروہوں کا مضحکہ اڑانا ہوتا ہے۔

طنز کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔وزیر آغا کہتے ہیں ''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنالیا ہو۔طنز میں نشتریت کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے۔'' (اردو ادب میں طنز ومزاح)

طنز نگار ایک سماجی مصلح ہوتا ہے۔سماج میں موجود نقائص اور عیوب کو طنز نگار بڑی فن کاری کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔گویا کہ طنز نگار ایک سرجن ہوتا ہے جو اپنے نشتر سے سماج میں موجود فاسد مادوں کا خارج کرتا رہتا ہے۔معیاری طنز وظرافت کی بنیاد غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ

رکھی۔مہدی افادی،محفوظ علی بدایونی،خواجہ حسن نظامی،سلطان حیدر جوش،سجاد حیدر یلدرم،منشی پریم چند،سجاد علی انصاری،مرزا فرحت اللہ بیگ،قاضی عبدالغفار، ملا رموزی،رشید احمد صدیقی،سید احمد پطرس بخاری،شوکت تھانوی،کنھیا لال کپور،کرشن چندر،شفیق الرحمن ،ابراہیم جلیس اور مشتاق احمد یوسفی ممتاز طنز نگار ہیں۔

(C) تنقید:

تنقید عربی کا لفظ ہے جو نقد سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ''کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا'' ہے۔اصطلاح میں اس کا مطلب کسی ادیب یا شاعر کے فن پارے کے حسن و قبح کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنا ہے۔خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب نے موضوع کے لحاظ سے اپنی تخلیقی کاوش کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔مختصراً فن تنقید وہ فن ہے جس میں کسی فنکار کے تخلیق کردہ ادب پارے پر اصول و ضوابط و قواعد اور حق و انصاف سے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا جاتا ہے اور حق و باطل ،صحیح و غلط اور اچھے اور برے کے مابین ذاتی نظریات و اعتقادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرق واضح کیا جاتا ہے۔اس پرکھ اور تول کی بدولت قارئین میں ذوق سلیم پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔انگریزی میں تنقید کو Criticism کہتے ہیں۔اس کا ماخذ یونانی لفظ Krinien ہے۔ویسے مختلف نقادوں نے اس کی مختلف تعریف و توضیحات کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) کسی ادب پارے میں فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا۔

(۲) تنقید کامل علم و بصیرت کے ساتھ اور موزوں اور مناسب طریقے سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے محاسن و معائب کی قدر شناسی یا اس بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔

(۳) تنقید اس عمل یا ذہنی حرکت کا نام ہے جو کسی شے یا ادب پارے کے بارے میں ان خصوصیات کا امتیاز کرے جو قیمت رکھتی ہے۔بخلاف ان کے جن میں قیمت نہیں۔

(۴) محدود معنوں میں تنقید کا مطلب کسی ادب پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ ہے، وسیع تر معنوں میں اس میں تنقید کے اصول قائم کرنا اور ان اصولوں کو تنقید کے لیے استعمال کرنا بھی شامل ہے۔

(۵) تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح کے بعد اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔

(۶) سچی تنقید کا فرض ہے کہ وہ زمانہ قدیم کے عظیم فن کاروں کی بالترتیب درجہ بندی اور رتبہ شناسی کرے اور زمانہ جدید کی تخلیقات کا بھی امتحان کرے۔بلند تر نوع تنقید یہ بھی ہے کہ نقاد کے انداز و اسلوب کا تجزیہ کرے اور ان وسائل کی چھان بین کرے جن کی مدد سے شاعر اپنے ادراک و کشف کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

(۷) تنقید، فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے مناصب و وظائف اور فوائد کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کو تسکین پہنچاتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری یا نظم اچھی ہے یا بری۔(ایلیٹ)

(D) تحقیق

تحقیق کا لفظی معنی پیدائش، آفرینش، پیدا کرنا، وجود میں لانا، تصنیف، اختراع اور ایجاد ہے۔تحقیق حق کی نقاب کشائی ہے۔سات پردوں میں چھپی سچائی کو ڈھونڈنا، مرتب کرنا اور ارباب علم و دانش کے سامنے پیش کرنے کا عمل تحقیق کہلاتا ہے۔تنقید کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔نقد کہتے ہیں پرکھنے یا کسوٹی پر کسنے کو۔اس کا پتہ لگانا کہ یہ چمکنے والی چیز سچ مچ سونا ہے، یا پیتل پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے، تحقیق نہیں تو اور کیا ہے؟ تحقیق و تنقید صرف ادب کی چھان بین اور موشگافی نہیں بلکہ ایک طرز زندگی، احقاق حق اور ابطال باطل بھی

ہے۔آسان طبیعتیں تحقیق کے صبر آزما طریق کار کی متحمل نہیں ہو پاتیں،اسی لیے اس مشکل ڈگر کے بہت کم لوگ مسافر بنتے ہیں۔نصیرالدین ہاشمی،محمود شیرانی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر سیدہ جعفرہ اور مولوی عبدالحق وغیرہ اردو ادب کے نامور محققین ہیں۔

(E) تذکرہ

تذکرہ ایک مرکب صنف ادب ہے۔اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر احوال اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو علاوہ ازیں شعرا کے کلام پر مختصر الفاظ میں تنقیدی رائے بھی دی گئی ہو۔سب سے پہلے شعرا کے حالات میں جو تذکرہ لکھا گیا وہ سر زمین ملتان میں ''لباب الالباب'' کے نام سے عوفیؔ نے لکھا۔یہ روایت آئندہ زمانے میں بھی ایران سے زیادہ ہندستان میں برقرار رہی اور عہد مغلیہ میں زبان فارسی میں کچھ اہم تذکرے لکھے گئے۔''طبقات اکبری'' اور ''منتخب التواریخ'' وغیرہ میں معاصرین شعرا کے مستند ترین حالات ملتے ہیں۔تاریخوں کے علاوہ دوسرے فنون میں کتابیں بھی بحیثیت تذکرہ اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں '' ہفت اقلیم'' کا نام سرفہرست ہے۔آخری مغل دور میں آرزوؔ اور خوشگو کے مستند تذکرے ملتے ہیں۔اُردو ادب کی ابتداء فارسی کے علما اور شعرا نے کی اور اُردو تذکرہ نگاری بھی فارسی تذکرہ نویسوں نے شروع کی یا ان کے پیروکاروں نے اس فن کو فروغ دیا۔چنانچہ عہد مغلیہ کے آخری زمانے میں ہمیں ایسے تذکرے ملتے ہیں جن میں اُردو اور فارسی زبانوں کے شاعروں کے حالات موجود ہیں اور اس کے بعد ایک ایسا عہد بھی آیا جب ایک ہی تذکرہ نگار نے فارسی اور اُردو شعرا کے الگ الگ تذکرے لکھے اور یہی وہ زمانہ بھی تھا جب مختلف مصنفین نے صرف اُردو شعرا کے تذکرے لکھے جن میں سرفہرست اردو زبان

کا پہلا تذکرہ ''تذکرۂ گلشن ہند'' (مرزا علی لطفؔ)،تذکرہ شعرائے اردو (میر حسنؔ)،تذکرۂ گلشن بے خار (مصطفی خاں شیفتہؔ)،انتخاب یادگار (امیر مینائی)،انتخاب دواوین (امام بخش صہبائی)، آب حیات وسخن دان فارس (محمد حسین آزادؔ)،تذکرۃ المعاصرین وسخن الشعراء (عبدالغفور نساخؔ)،تذکرہ ماہ وسال وتذکرۂ معاصرین (مالک رام)،مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم)،گل رعنا (مولوی عبدالحیٰ) اور فارسی میں میر تقی میرؔ کا ''نکات الشعراء''، فتح گردیزی کا ''تذکرۂ ریختہ گویاں'' اور قیام الدین قائمؔ کا ''مخزن نکات''،محمد ابراہیم خلیل،لچھمی نرائن شفیق،قدرت اللہ شوق اور غلام ہمدانی مصحفیؔ وغیرہ کے تذکرے بھی کافی مقبول ہیں۔

اصولی طور پر تذکرہ ذکر کے معنی سے مربوط ہے،عربی سے اُردو میں مروج ہونے والا یہ لفظ مجرد حیثیت سے اُردو میں رواج پایا اور فارسی کے زیر اثر اُردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت حاصل ہوئی۔عام انداز میں تذکرہ بہ معنی ذکر کے مروج ہے لیکن اصطلاحی اعتبار سے تذکرہ متعدد اشخاص کے حالات اور کارناموں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی شہادت دیتا ہے۔یعنی تذکرہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اور انفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب تک کئی اہم شخصیتوں کو مربوط نہ کیا جائے اس کی حیثیت تذکرہ نہ ہوگی۔عام طور پر ایسی تمام تحریریں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیے گئے ہوں اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی،سیاسی،سماجی، ثقافتی،غرض کہ ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا تذکرہ کہلاتا ہے۔

☆کتابیات

(۱) اقبال، ڈاکٹر،کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۰ء

(۲) اطہر پرویز، ہمارے پسندیدہ افسانے،، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۴ء

(۳) اُم ہانی اشرف، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء

(۴) اُم ہانی اشرف، ڈاکٹر، اُردو قصیدہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۴ء

(۵) ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، آغا حشر کاشمیری عہد اور ادب، اُردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۷ء

(۶) الطاف حسین حالؔی، یادگارِ غالبؔ، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

(۷) احمد رضاؔ مولانا، حدائق بخشش، رضا اکیڈمی، ۲۰۱۱ء

(۸) اُردو ادب (اختیاری مضمون)، بی اے سال اول، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، ۲۰۰۷ء

(۹) اُردو ادب (نثر)، بی اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء

(۱۰) اُردو ادب (ادبی تنقید)، بی اے سال سوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، ۲۰۱۱ء

(۱۱) اُردو ادب (نظم)، بی اے سال سوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، ۲۰۱۱ء

(۱۲) دردانہ قاسمی، داستان ناول اور افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۴ء

(۱۳) درس بلاغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ۲۰۱۲ء

(۱۴) داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ (ساتواں پرچہ)، ایم اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی، ۲۰۰۷ء

(۱۵) رجب علی بیگ سرورؔ، فسانۂ عجائب، انجمن ترقی اردو دہلی، ۲۰۱۳ء

(۱۶) سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۱۷) سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۱۸) سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادبِ اُردو، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۶۴ء

(۱۹) عظیم الحق جنیدی، اُردو ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۵ء

(۲۰) عبادت بریلوی، اُردو تنقید کا ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۲۱) عبدالصمد دہلوی، آئین اردو، ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء

(۲۲) غیر افسانوی ادب (آٹھواں پرچہ)، ایم اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، ۲۰۰۷ء

(۲۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی بہترین مثنویاں، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۴ء

(۲۴) قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر، مثنوی سحر البیان،، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۲۵) میر امنؔ، باغ و بہار، اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

(۲۶) محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۲۷) محمد حسنین، پروفیسر، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء

(۲۸) مظہر احمد، پیروڈی، شبانہ پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۹۱ء

(۲۹) نورالحسن نقوی، پروفیسر، فن تنقید اور تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۳۰) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

(۳۱) وقار عظیم، نیا افسانہ،، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

(۳۲) ریختہ ڈاٹ کام

(۳۳) وکی پیڈیا

☆☆☆☆